۱۹

عملی اصلاح کے اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جائے

(فرمودہ ۲۹؍مئی ۱۹۳۶ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

پہلے تو میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ تحریک جدید کے متعلق سال میں دو جلسے ایسے منعقد کئے جایا کریں جن میں اس تحریک کے اغراض اور اس کے مقاصد، اس کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کے پورا کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی جائے اور لوگوں پر اِس تحریک کے مطالبات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اس عمدگی سے یہ تحریک ان کے ذہن نشین کی جائے کہ وہ جو سُست ہیں چُست ہو جائیں، جو ناواقف ہیں وہ واقف ہو جائیں اور جو پہلے ہی چُست ہیں وہ اور زیادہ چُست اور ہوشیار ہو جائیں۔ اس سال ان جلسوں کے متعلق اعلان کرنے میں کسی قدر تأخیر ہوگئی ہے اس لئے آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جون کے مہینہ میں اٹھائیس تاریخ کو جو اتوار کا دن آتا ہے اُس دن تمام جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر جلسے منعقد کریں جن میں تحریک جدید کے مختلف شعبوں کے متعلق تقاریر کی جائیں اور مضامین پڑھے جائیں اور جہاں اچھے لیکچرار میسر نہ آسکیں وہاں کی جماعت کے افراد کو چاہئے کہ وہ تحریک جدید کے متعلق میرے گزشتہ خطبات کو نکال کر وہی لوگوں کو سنا دیں اور نہایت اچھی طرح اس تحریک کی ضرورت، اس کے اغراض اور اس کے مقاصد کی تشریح وتوضیح کی جائے۔

اس کے بعد میں اس مضمون کو لیتا ہوں جس کا کسی قدر حصہ پچھلے جمعہ کے خطبہ میں مَیں

نے بیان کیا تھا۔ وہ مضمون یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دو باتیں ہمارے سامنے پیش کی تھیں۔ ایک تو عقائد کی اصلاح کے متعلق تھی اور ایک اعمال کی اصلاح کے متعلق تھی۔ عقائد کی اصلاح کے متعلق جو تعلیم حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش فرمائی اس کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس میں ہمیں ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ وہی امور جن کے متعلق لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر کفر کے فتوے لگاتے تھے، جنہیں خلافِ عقل تسلیم کرتے تھے اور جن کو ماننے اور قبول کرنے کیلئے ملک کا کوئی طبقہ بھی تیار نہ تھا آج ہماری جماعت کے شدید سے شدید معاند اور بدترین مخالف بھی نہ صرف یہ کہ ان کی تردید نہیں کرتے بلکہ انہیں تسلیم کرتے اور ان کی درستی کا اقرار کرتے ہیں اور اب بجائے یہ اعتراض کرنے کے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف عقائد دنیا میں پھیلائے لوگ اگر کہتے ہیں تو یہ کہ یہ سب باتیں تو پہلے سے قرآن مجید میں موجود تھیں حضرت مرزا صاحب کا انہیں پیش کرنا ان کی کونسی خوبی اور کمال ہے۔ یہ تغیر کوئی معمولی تغیر نہیں پچاس سال کے اندر دنیا کے لاکھوں نہیں کروڑوں افراد کے قلوب میں ایسا حیرت انگیز اور عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جانا الٰہی نصرت اور اس کی تائید کے بغیر ممکن نہیں اور پھر یہ تغیر نہ صرف ہندوستان میں پیدا ہو چکا ہے، پیدا ہو رہا ہے اور پیدا ہوتا چلا جائے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اِس تغیر کو رونما ہونے سے نہیں روک سکتی لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو تعلیم عملی اصلاح کے متعلق پیش کی اِس کی نسبت ہم دیکھتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ اِس پہلو میں ہمارا پلہ دشمنوں پر بھاری ہوتا اور ہم دشمنوں کے اعمال میں بھی ایک بہت بڑی اصلاح کر سکتے یا کم از کم اس تعلیم کے نتیجہ میں ہم اپنے اندر ہی ایسی اصلاح کر سکتے جس کو دیکھ کر ہمیں اپنے دل میں یہ محسوس ہوتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تعلیم پر ہم نے عمل کر لیا ہے جو عملی اصلاح کے متعلق آپ نے پیش فرمائی ہمیں نظر یہ آتا ہے کہ ہم دشمن کے عمل سے متأثر ہو رہے ہیں اور اُس کی غلطیاں بار بار ہمارے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں اور ہم میں سے جو کمزور لوگ ہیں بسا اوقات وہ ان غلطیوں کا شکار ہو جاتے اور دشمن کے بد اثرات سے متأثر ہو جاتے ہیں۔ گویا عقیدے کی جنگ میں ہمارا پہلو جارحانہ اور ہمارے مخالف کا پہلو مدافعانہ ہے مگر عمل کی جنگ میں ہمارے دشمن کا پہلو جارحانہ اور ہمارا پہلو مدافعانہ ہے اور

بجائے اس کے کہ ہمارے اندر ایسی قوت ہو کہ ہم دشمن اور اس کے ساتھیوں کے اعمال میں بھی ایک تغیر پیدا کر دیں اور اسے ہمارا حملہ بچانا پڑے دشمن ہمارے گھروں میں گھس گھس کر ہماری جماعت کے نوجوانوں اور کمزور طبع لوگوں میں نقص پیدا کرتا رہتا ہے اور ہمارا سارا وقت اِس اندرونی نقص کی اصلاح میں ہی صرف ہو جاتا ہے۔ وہ موقع ہی نہیں آتا کہ ہم دشمن کے اعمال کی بھی اصلاح کریں اور اس کے نقائص کا قلع قمع کریں تا اس کے بداثرات ہمارے اندر داخل ہی نہ ہوسکیں۔ گویا ہماری مثال اس واقعہ سے ملتی جلتی ہے جو ایک بزرگ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ تھے جن کے پاس ان کا ایک شاگرد کافی عرصہ رہا اور تعلیم حاصل کرتا رہا جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے گھر جانے لگا تو ان بزرگ نے اُس سے دریافت کیا کہ میاں تم اپنے گھر جارہے ہو کیا تمہارے ملک میں شیطان بھی ہوتا ہے؟ وہ یہ سوال سن کر حیران رہ گیا اور اس نے کہا شیطان بھلا کہاں نہیں ہوتا ہر ملک میں شیطان ہوتا ہے اور جہاں میں جارہا ہوں وہاں بھی شیطان موجود ہوگا۔ آپ نے فرمایا اچھا اگر وہاں شیطان ہوتا ہے تو پھر جو کچھ تم نے میرے پاس رہ کر علم حاصل کیا ہے جب اس پر عمل کرنے لگو گے تو لازماً شیطان تمہارے رستہ میں روک بن کر حائل ہوگا ایسی حالت میں تم کیا کرو گے؟ وہ کہنے لگا میں شیطان کا مقابلہ کروں گا۔ وہ بزرگ کہنے لگے بہت اچھا تم نے شیطان کا مقابلہ کیا اور وہ تمہارے دفاع کی تاب نہ لاکر بھاگ گیا لیکن جب پھر تم عمل کی طرف متوجہ ہونے لگے اور خدا تعالیٰ کے قُرب کے حصول کے رستوں پر تم نے چلنا شروع کیا اور پھر شیطان پیچھے سے آ گیا اور اس نے تمہیں پکڑ لیا اور تمہیں آگے بڑھنے سے روک لیا تو پھر تم کیا کرو گے؟ وہ کہنے لگا میں پھر شیطان کا مقابلہ کروں گا اور اس سے پیچھا چھڑا کر اللہ تعالیٰ کے قُرب کے حصول کی جدوجہد میں مشغول ہو جاؤں گا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا میں نے مان لیا کہ تمہارے مقابلہ کرنے کے نتیجہ میں شیطان اس دفعہ بھی بھاگ گیا اور تم جیت گئے لیکن جب پھر تم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کیلئے جدوجہد کرنے لگے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے ذرائع اختیار کرنے لگے اور تم نے شیطان کی طرف سے پیٹھ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کیا تو پھر شیطان آ گیا اور اس نے تمہیں پکڑ لیا تو پھر کیا کرو گے؟ شاگرد حیران سا رہ گیا اور وہ کہنے لگا مجھے تو پتہ نہیں لگتا آپ ہی فرمائیں کہ مجھے ایسی

حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ وہ فرمانے لگے اچھا یہ بتاؤ اگر تم اپنے کسی دوست سے ملنے جاؤ جس نے اپنے مکان کی حفاظت کیلئے ایک بڑا سا مضبوط کُتّا رکھا ہوا ہو اور جب تم اپنے دوست کے مکان میں داخل ہونے لگو تو وہ کُتّا آئے اور تمہاری ایڑھی پکڑ لے تو اُس وقت کیا کرو گے؟ شاگر کہنے لگا میں کُتّے کا مقابلہ کروں گا اور اسے ماروں گا اگر میرے پاس سوٹی ہوگی تو میں اُسے سوٹی ماروں گا، پتھر قریب ہوگا تو وہ اُٹھا کر دے ماروں گا۔ انہوں نے کہا ٹھیک تم نے کُتّے کو سوٹی ماری یا پتھر مارا اور وہ بھاگ گیا لیکن جب پھر تم نے اندر مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی اور کُتّے کی طرف سے پیٹھ پھیری تو وہ پھر آ گیا اور اس نے تمہاری ایڑی پکڑ لی تو اُس وقت کیا کرو گے؟ وہ کہنے لگا میں اُسے پھر ماروں گا اور اُسے ہٹا کر مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ انہوں نے فرمایا اچھا فرض کرو دوسری دفعہ بھی کُتّا بھاگ گیا لیکن جب پھر تم دوست سے ملنے کیلئے مکان کے اندر داخل ہونا چاہو تو وہ پھر تمہیں پکڑ لے ایسی حالت میں کیا کرو گے؟ وہ کہنے لگا میں پھر اسے ماروں گا اور اسے ہٹانے کی پوری کوشش کروں گا۔ وہ بزرگ فرمانے لگے اگر یہ جنگ اسی طرح جاری رہے گی کہ جب تم مکان کے اندر داخل ہونا چاہو تو کُتّا تمہاری ایڑی آ پکڑے اور جب تم اُسے مارو تو وہ بھاگ جائے لیکن جب پھر مکان کے اندر داخل ہونے لگے تو وہ پھر آ کر پکڑ نا چاہے تو تم اپنے دوست سے مل کس طرح سکو گے اور اس سے ملاقات کا جو مقصد تم لئے ہوئے ہو گے وہ کس طرح پورا ہوگا؟ شاگرد کہنے لگا جب میں یہ دیکھوں گا کہ یہ جنگ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی اور کُتّا بار بار مجھے آ پکڑتا ہے تو میں اپنے دوست کو آواز دوں گا کہ میاں! تمہارا کُتّا مجھے نہیں چھوڑتا اسے آ کر ہٹاؤ۔ وہ بزرگ فرمانے لگے بس یہی نسخہ تم نے شیطان کے مقابلہ میں بھی استعمال کرنا ہے۔ شیطان اللہ میاں کا کُتّا ہے اور جب انسان پر بار بار حملہ آور ہو اور اللہ تعالیٰ کے قریب نہ ہونے دے تو اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پکارو اور اُسے آواز دو کہ اللہ میاں! میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں مگر آپ کا یہ کُتّا مجھے آنے نہیں دیتا اسے روکئے تا میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ اسے روک لے گا اور تم اس کے قُرب میں بڑھتے چلے جاؤ گے یہی شیطان کے حملوں سے بچنے کا علاج ہے ورنہ مقابلہ کی صورت میں تو انسان کسی طرح اپنے ربّ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا۔ تو ہماری حالت اِس وقت اس واقعہ کے پہلے حصہ کے مطابق ہے ہم

چاہتے ہیں کہ ہم نیک باتوں پر عمل کریں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے میدان میں ترقی کرتے چلے جائیں مگر شیطان ہماری ایڑی پکڑ لیتا ہے اور ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ ہم اسے مارتے اور اپنے رستہ سے ہٹاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بجائے مدافعانہ پہلو کے جارحانہ پہلو اختیار کریں کہ پھر شیطان ہم پر حملہ کر دیتا ہے اور ہمارا کافی وقت اپنے آپ کو اس کے حملوں سے بچانے پر ہی صرف ہو جاتا ہے۔ پس ہم اب تک اس کے دفاع اور اپنی حفاظت کی تدبیروں میں ہی لگے ہوئے ہیں اور اس سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہم اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوں اور بجائے مدافعانہ کے جارحانہ پہلو اختیار کریں حالانکہ ہمارا کام یہ نہ تھا کہ ہم اپنے بچاؤ کی تدابیر میں ہی لگے رہیں بلکہ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم خود اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے اور تمام دنیا میں ایک ایسا تغیر پیدا کر دیتے کہ اپنے تو الگ رہے غیروں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ڈھل جاتے لیکن ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہمیں ابھی شیطان کے حملوں سے بچاؤ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اپنے اعمال بھی ابھی تک اس قابل نہیں ہوئے کہ ہم ان پر مطمئن ہو سکیں۔

اب تو اکثر ایسا ہؤا ہے کہ شیطان آتا ہے اور ہمارے ایک آدمی کو بہکا کر لے جاتا ہے ہم سارا دن اُس کی تلاش اور جستجو میں لگے رہتے ہیں لیکن جب شام ہونے کے قریب ہوتی ہے اور ہم اسے تلاش کر کے واپس لا رہے ہوتے ہیں تو ہمیں آواز آتی ہے کہ ہم میں سے دو اور آدمیوں کو شیطان بہکا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ پھر ہم ان کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آواز آتی ہے کہ فلاں آدمی کو بھی شیطان پکڑ کر لے گیا ہے۔ غرض ہم میں اور شیطان میں ایک جنگ جاری ہے اور جنگ بھی ایسی کہ جس میں ہماری مثال دشمن سے بھاگے ہوئے شکست خوردہ لوگوں کی سی ہے۔ ہم ایک کو بچاتے ہیں تو دشمن دو کو لے جاتا ہے، ہم دو کو بچاتے ہیں تو وہ تین آدمی لے جاتا ہے، ہم تین کو بچاتے ہیں تو وہ چار لے جاتا ہے۔

غرض عقیدہ کی جنگ میں جہاں ہم نے دشمن کو ہر میدان میں شکست دی اور نہ صرف میدانوں میں اسے شکست دی بلکہ ہم اس کے گھروں پر حملہ آور ہوئے اور ہم نے اسے ایسا لتاڑا اور ایسا لتاڑا کہ اب اس میں سر اٹھانے کی بھی تاب نہیں رہی۔ دشمن کے ہر گھر میں گھس کر ہم نے اس کے باطل عقائد کو کچلا اور اسے ایسی کھلی شکست دی کہ دشمن کیلئے اس سے زیادہ کھلی اور ذلّت کی

شکست اور کوئی نہیں ہوسکتی وہاں عمل کے میدان میں ہم دشمنوں میں محصور ہوگئے اور ہمارے لئے ان سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں آدمی وہ ہم میں سے نقائص اور عیوب میں مبتلا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ایک جگہ سے بھاگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسری جگہ امن ملے گا مگر وہاں بھی نقص آموجود ہوتا ہے، پھر وہاں سے بھاگ کر تیسری طرف جاتے ہیں تو وہاں بھی دشمن آموجود ہوتا ہے، تیسری جگہ سے بھاگ کر چوتھی طرف جاتے ہیں تو اس جگہ بھی دشمن ہمارے مقابلہ کیلئے موجود ہوتا ہے گویا جس طرح چاروں طرف جب آگ لگ جاتی ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے اور وہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا کرے یہی اِس وقت ہماری حالت ہے۔

مجھے اس پر اپنا ایک رؤیا یاد آ گیا ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء کی بات ہے میں سویا ہؤا تھا کہ میں نے دیکھا ایک جگہ آگ لگ گئی ہے میں اُسے بجھانے کیلئے اٹھا تو میں نے دیکھا ایک اور طرف سے بھی آگ کے شعلے نکلنے شروع ہوگئے ہیں اور وہ پہلی آگ سے زیادہ تیز شعلے ہیں مَیں دوڑ کر اُسے بجھانے کیلئے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تیسری طرف بھی آگ لگ گئی ہے اور وہ آگ دوسری آگ سے بھی زیادہ بھڑکنے والی ہے۔ یہ دیکھ کر میں اس آگ کی طرف اسے بجھانے کیلئے بھاگا تو دیکھا تو چوتھی طرف بھی آگ لگی ہوئی ہے اور وہ پہلی تینوں آگوں سے زیادہ تیز ہے۔ یہ دیکھ کر میں خواب میں سخت گھبرا گیا اور میں کہتا ہوں نامعلوم اب کیا ہوگا آگ ہر طرف لگ رہی ہے اور اس کا ہر شعلہ پہلے شعلوں سے زیادہ تیز ہے۔ میں اسی گھبراہٹ کی حالت میں حیران ہو کر کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں۔ آپ نے پوچھا تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ میں نے کہا حضور! چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے میں ایک جگہ کی آگ بجھاتا ہوں تو دوسری جگہ نکل آتی ہے، دوسری جگہ کی آگ بجھاتا ہوں تو تیسری جگہ نکل آتی ہے اور ہر آگ پہلی آگ سے زیادہ تیز ہے جو کسی طرح بجھنے میں نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا یہ آگ یوں نہیں بجھے گی اِس آگ کی ایک کنجی ہے جو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے زمین میں ایک سوراخ دکھایا اور فرمایا یہ اس آگ کی کنجی ہے۔ پھر آپ نے اشارہ کیا کہ اِس سوراخ کو بند کر دو اس پر میں نے اس سوراخ کو زور سے دبا دیا اور میں نے دیکھا کہ

جونہی میں نے اس سوراخ کو دبایا تمام آگیں بُجھ گئیں اور کوئی شعلہ باقی نہ رہا۔ یہ نظّارہ جو میں نے ۱۹۲۲ء میں یا ۱۹۲۳ء میں دیکھا تھا درحقیقت ہماری جماعت کے مردوں اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی عملی زندگی کا ایک نظّارہ تھا۔ ہم بھی ایک بُرائی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری نکل آتی ہے، دوسری بُرائی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو تیسری نکل آتی ہے، تیسری بُرائی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو چوتھی نکل آتی ہے، پھر اس جنگ میں ہماری ہمدردی بھی متحد نہیں اور نہ ہماری آواز یکساں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے تو ساری جماعت شور مچانا شروع کر دیتی ہے کہ ہاں ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے ہیں انہیں فوت ہونے دو کیونکہ ان کی موت میں ہی اسلام کی حیات ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید بالکل محفوظ ہے اور اس کی کوئی آیت منسوخ نہیں تو ساری جماعت چلاّتی ہے کہ بالکل درست قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہم خود مٹ جائیں گے لیکن قرآن کریم کی کسی آیت کو مٹنے نہیں دیں گے، جب ہم کہتے ہیں انبیاء علیہم السلام بالکل معصوم ہوتے ہیں اور ان کی طرف کسی گناہ کو منسوب کرنا ناجائز ہے تو تمام جماعت کی آواز اس آواز کے ساتھ متحد ہوتی ہے اور وہ کہتی ہے ٹھیک ہے واقعہ میں انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں اور ہم کبھی کسی کے منہ سے یہ سننے کیلئے تیار نہیں کہ کسی نبی نے کوئی گناہ کیا۔

غرض عقائد کی اصلاح کے متعلق جب ہم آواز اٹھاتے ہیں تو ساری جماعت کی طرف سے آواز آنے لگتی ہے کہ درست درست لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں لکھا ہے اپنی اولادوں کو ورثہ دو اور لڑکیوں کو بھی شریعت کے مطابق اسی طرح حصہ دو جس طرح لڑکوں کو دیتے ہو تو بجائے سب کی طرف سے متحد طور پر یہ آواز اُٹھنے کے ہاں ہاں یہ بالکل درست ہے ورثہ کا حکم نہایت ضروری ہے اور لڑکیوں کو ورثہ میں نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آواز دھیمی پڑنی شروع ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمیں اپنوں میں سے ہی بعض کے منہ سے یہ آواز سنائی دینے لگتی ہے کہ لڑکیوں کو ورثہ دینا بڑا مشکل کام ہے اس سے تو ہماری ناکیں کٹ جائیں گی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ آؤ اور باجماعت نماز پڑھو سارے قرآن کریم میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ مؤمن وہ ہیں جو يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ[1] نمازوں کو قائم کرتے ہیں یہ کہیں نہیں لکھا کہ

يُصَلُّوْنَ الصَّلٰوةَ مؤمن وہ ہیں جونماز پڑھیں بلکہ نماز کے ساتھ ہر جگہ یُقِیْمُوْنَ کا لفظ آتا ہے اور اقامت ہمیشہ نماز باجماعت میں ہی ہوتی ہے اکیلے نماز پڑھنے میں نہیں ہوتی تو اس آواز کے جواب میں بجائے اس کے کہ جس طرح ہم کہتے ہیں حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے اور ساری جماعت متحد ہو کر کہتی ہے ہاں ہاں فوت ہو گئے انہیں فوت ہونے دو کیونکہ ان کی موت قرآن مجید سے ثابت ہے، یہاں یہ آوازیں نہیں آتیں کہ ہاں ہاں یہ درست ہے نماز ہمیشہ باجماعت ہی پڑھنی چاہئے بلکہ یہ آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ یہ تو بڑا مشکل کام ہے دنیا کے کاموں میں ہم مشغول ہوتے ہیں نماز باجماعت ہم کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء بالکل معصوم ہوتے ہیں اور وہ گناہوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تو ہماری جماعت کے سب دوست مل کر کہنے لگ جاتے ہیں کہ بالکل درست انبیاء واقعہ میں معصوم ہوتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مؤمنوں پر زکوٰۃ فرض ہے اور ہر مؤمن مرد اور ہر مؤمن عورت جس پر زکوٰۃ کا دینا فرض ہے اُسے چاہئے کہ زکوٰۃ دے تو بجائے یہ آواز آنے کے کہ درست ہے درست ہے جو شخص زکوٰۃ دینے کے قابل ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں دیتا وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا یہ آواز آنے لگ جاتی ہے کہ آجکل کے حالات کے لحاظ سے تو یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اسی طرح عقائد کی اصلاح کیلئے جب اور بیسیوں باتیں کہی جاتی ہیں تو اُن کی تائید اور تصدیق میں جماعت کی طرف سے آوازیں اُٹھتی ہیں لیکن جب ہم کہتے ہیں سچ بولنا چاہئے تو ہمیں آواز سنائی دیتی ہے کہ سچ اچھی چیز ہے مگر کیا کریں جھوٹ کے بغیر آجکل گذارہ نہیں ہو سکتا۔

غرض عمل کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس پر جماعت متفقہ طور پر قائم ہو۔ بڑی بڑی قربانیوں کو جانے دو جانی قربانیوں، مالی قربانیوں اور جذبات کی قربانیوں کو ایک طرف رکھو، چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی اگر لے لیا جائے تو صاف طور پر ان کے متعلق بڑبڑانے کی آوازیں سنائی دیں گی۔ سچ بولنا کتنی معمولی بات ہے مگر لوگ اس پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اور زیادہ بڑی باتوں کو جانے دو منہ پر کچھ بال رکھ لینا کونسی بڑی مصیبت ہے مگر لوگ داڑھی منڈوا دیں گے اسے رکھنا پسند نہیں کریں گے اور جب انہیں توجہ دلائی جائے تو کہہ دیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کے ساتھ تعلق تھا اُن کو اِس سے کیا غرض اور اسلام کو اس سے کیا واسطہ کہ کوئی داڑھی رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ مجھ سے ہی

ایک دفعہ کچھ نوجوانوں نے گفتگو کی اور کہا ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اسلام کا داڑھی سے کیا تعلق ہے اور اسلام کو اس سے واسطہ کیا ہے کہ ہم اپنے منہ پر چند بال رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے ہیں؟ میں نے کہا واقعہ میں اسلام کو ہرگز اس سے کوئی تعلق نہیں کہ کوئی اپنے منہ پر داڑھی رکھتا ہے یا نہیں مگر اسلام کو اس بات سے ضرور تعلق ہے کہ محمد ﷺ کی اطاعت کی جائے، ان کی باتوں کو قبول کیا جائے اور ان کے نمونہ کو اختیار کیا جائے۔ پس یہ سوال نہیں کہ اسلام کا داڑھی سے تعلق ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اسلام کا محمد ﷺ کی اطاعت سے تعلق ہے یا نہیں۔ اگر تعلق ہے تو پھر ضروری ہے کہ داڑھی کے معاملہ میں بھی محمد ﷺ کی اطاعت کی جائے اور جو شخص محمد ﷺ کی اتنی چھوٹی سی بات ماننے کیلئے تیار نہیں اس سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑی بڑی قربانیوں کیلئے تیار ہو سکے گا۔ جو شخص ایک پیسہ دینے کیلئے تیار نہیں وہ ہزار روپیہ کہاں دے سکتا ہے۔ جب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ہماری جماعت اس بات کی بھی محتاج ہے کہ اُسے بار بار سمجھایا جائے اور وعظ کیا جائے تو وہ بڑے بڑے عظیم الشان تغیرات جو اسلام کے مدّ نظر ہیں اور جن تغیرات کے پیدا کرنے کیلئے انسان کو اپنا نفس قربان کر دینا پڑتا ہے اُن کی باری ہی کب آئے گی۔ ابھی تو سر پر بودے رکھنا اور داڑھیاں مَنڈوانا اور مونچھیں بڑھانا اور نکٹائیاں لگانا اور پتلونیں پہننا اور سگریٹ نوشی کرنا اور حُقّہ پینا یہی باتیں ہماری توجہ کو کھینچے ہوئے ہیں حالانکہ وہ تغیر جو اسلام تمدّنِ عالم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ تغیر جس کے ماتحت اسلام تمام دنیا کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے، وہ تغیر جس کے ماتحت امیر اور غریب کا فرق اور حکومت اور رعایا کا امتیاز مٹ جاتا ہے اس کیلئے بہت بڑی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے مگر ہمیں اپنے اندر ابھی اُن قربانیوں کا مادّہ ہی نظر نہیں آتا۔ گویا ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک اتنا عظیم الشان محل تیار کرنا ہے جس میں ساری دنیا نے آرام کرنا ہے مگر اس کے سامانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ ابھی کدال تلاش کر رہا ہے جس سے وہ ذراسی مٹی کھرچ سکے۔ جس شخص کو ایک کدال بھی میسر نہیں کہ وہ اس سے بنیاد کھود سکے اور اس میں اینٹیں رکھ سکے وہ عظیم الشان محل کب تیار کرے گا اور کب ساری دنیا کو اپنے محل میں داخل کرنے کا پروگرام پورا کرے گا۔

پس یہ ایک مُعمّہ ہے جو ہمارے سامنے ہے اور یہ مُعمّہ ہے جسے ہم نے حل کرنا ہے اگر ہم

احمدیت کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں، اگر ہم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور مقدس رسول سمجھتے ہیں تو ہمیں اِس مُعمّہ کو پورے طور پر حل کرنا ہوگا ورنہ اس کے بغیر ہم کسی قسم کی برکت اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے امیدوار نہیں ہو سکتے ۔ ابھی تو ہم اُس شخص کی طرح پریشان پھر رہے ہیں جو بغیر سواری اور کسی ساتھی کے ایک مُہیب اور پُرخطر جنگل میں بھٹک جائے اور اُسے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کا راستہ نہ ملے۔ ہم بھی حیران و پریشان ایک ایسی زمین میں پھر رہے ہیں جس میں نہ کوئی انیس ہے نہ جلیس، نہ سواری ہے نہ ٹھہرنے کا مقام ایسی حالت کے ہوتے ہوئے خالی عقیدوں کو ہم نے کیا کرنا ہے اور ان سے دنیا میں کیا تغیر ہوسکتا ہے۔ حکومت ہمارے پاس نہیں کہ ہم جبر کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کریں اور ہٹلر یا مسولینی کی طرح جو شخص ہمارے حکموں کی تعمیل نہ کرے اُسے ملک سے نکال دیں اور جو ہماری باتیں سننے اور اس پر عمل کرنے کیلئے تیار نہ ہو اُسے عبرتناک سزا دیں۔ اگر حکومت پاس ہوتی تو ہم ایک دن کے اندر اندر یہ کام کر لیتے اور دوسرا دن ایسا نہ چڑھنے دیتے جس میں ہمارے اندر یہ نقائص موجود ہوتے۔ اگر آج حکومت ہمیں مل جائے اور ہم حکم نافذ کر دیں کہ ہر وہ شخص جو باجماعت نماز نہیں پڑھے گا اسے سات سال قیدِ سخت کی سزا دی جائے گی تو کوئی ہے جو نماز باجماعت نہ پڑھے گا مگر ہمارے پاس جو سزا ہے کہ ہم کہتے ہیں جو شخص باجماعت نماز نہیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اُس پر ناراض ہوگا مگر آجکل خدا تعالیٰ کی ناراضگی کی کون پرواکرتا ہے۔ لوگ انگریز کی ناراضگی سے ڈر جائیں گے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کام کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ ناراض ہوجائے گا تو وہ اس کی پروا نہیں کریں گے۔ اگر آج ہمارے پاس حکومت ہو اور ہم یہی اعلان کر دیں کہ جو شخص اپنی لڑکی کو ورثہ دینے کیلئے تیار نہیں اس کی جائیداد کو ضبط کر لیا جائے تو کیا ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا رہ جائے جو لڑکیوں کو ورثہ نہ دے۔ ہر شخص کہے گا کہ مَیں تو مدت سے یہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح لڑکی کو ورثہ دوں۔ غرض اگر ہمارے پاس حکومت ہوتی تو صبح سے شام نہیں ہونے پائے گی اور ساری اصلاحات آپ ہی آپ ہوجائیں گی لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس حکومت نہیں اس لئے ہم کو یہ سوال کسی اور طریق سے حل کرنا پڑے گا۔ یا تو حکومت کے کسی ایسے پہلو کو تلاش کرنا پڑے گا جو انگریزی حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے بھی قائم کیا جاسکتا ہو یا ایسے ذرائع کی تلاش کرنی پڑے گی جو بغیر حکومت کے ہمیں کام دے

سکیں اور لوگوں کی عملی زندگی میں اصلاح کرسکیں۔ بہرحال یہ سوال اس قابل ہے کہ غور اور فکر کے ساتھ اسے حل کیا جائے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سوال پر غور کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ اس سوال کا اطمینان بخش حل ہمیں مل جائے۔

مگر پیشتر اس کے کہ میں اس سوال کو لوں ایک اور امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ عمل کی اصلاح عقیدہ کی اصلاح کی نسبت کیوں مشکل ہوتی ہے۔اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سوال مختلف حالتوں میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔بعض زمانوں میں عقیدہ کی اصلاح عمل کی اصلاح سے زیادہ مشکل ہو جاتی ہے اور بعض زمانوں میں عمل کی اصلاح عقیدہ کی اصلاح سے زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ جب مصلح کے پاس حکومت ہو تو اُس وقت عمل کی اصلاح جلدی ہو جاتی ہے اور عقیدے کی اصلاح دیر میں ہوتی ہے کیونکہ اُس وقت ایسے منافق ساتھ شامل ہو جاتے ہیں جو گو عقیدتاً ساتھ نہیں ہوتے مگر حکومت سے فوائد حاصل کرنے کیلئے ظاہر میں عقیدہ بدل لیتے ہیں ایسی صورت میں ان کے باطنی خیالات قائم رہتے اور ان کی اصلاح بہت مشکل ہو جاتی ہے۔اسی لئے جب کسی مصلح کے پاس ظاہری حکومت ہو تو اُس کے زمانہ میں عقیدہ کی اصلاح عمل کی اصلاح کی نسبت زیادہ مشکل ہوتی ہے لیکن جب حکومت نہ ہو تو پھر عمل کی اصلاح دیر سے ہوتی ہے عقیدہ کی اصلاح جلدی ہو جاتی ہے کیونکہ حکومت نہ ہونے کی وجہ سے وہی لوگ ساتھ شامل ہوتے ہیں جن کے عقیدے درست ہو چکے ہوتے ہیں لیکن عمل میں چونکہ گہرے غور اور لمبی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہر وقت نگرانی اور دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے انسانوں سے بہت سی کمزوریاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

پس یہ سوال مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے جب مذہب کے پاس حکومت ہو تو اُس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقیدے کی اصلاح عمل کی اصلاح سے کیونکر زیادہ مشکل ہے جیسے قرآن مجید میں آتا ہے کہ بعض لوگ ہمارے رسول کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں اٰمَنَّا۔ ہمارے عقائد بالکل درست ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ مت کہو بلکہ تم اگر کہنا چاہو تو کہو کہ اَسْلَمْنَا [2] ہمارا ظاہر درست ہے اور ہم ظاہر میں تمام احکامِ اسلام کو مان رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے پاس حکومت تھی مگر آج وہ زمانہ ہے کہ جب لوگ کہتے ہیں کہ اَسْلَمْنَا۔تو ہم

کہتے ہیں یہ درست نہیں تمہارا ظاہر ابھی تک اسلام کے مطابق نہیں ہوا ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اٰمَنَّا کیونکہ تمہارے عقائد درست ہیں۔

غرض قرآن کریم کی یہ آیت اِس زمانہ میں اپنے مفہوم کو بالکل اور رنگ میں ظاہر کرے گی۔ پہلے یہ سوال ہوتا تھا کہ عقیدہ کی اصلاح کیوں مشکل ہے اور اس زمانہ میں یہ سوال ہے کہ عمل کی اصلاح کیوں مشکل ہے اور بغیر حکومت کے اس مشکل کا حل کیا ہے۔ اس غرض کیلئے سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اعمال کی اصلاح میں کونسی چیزیں روک ثابت ہوتی ہیں تا ہمیں علاج معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ اس سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چیز جو عمل کی اصلاح کو مشکل بنا دیتی ہے وہ لوگوں کا یہ احساس ہے کہ ایک گناہ بڑا ہوتا ہے اور ایک چھوٹا ہوتا ہے۔ عمل کی اصلاح میں یہ سب سے بڑی روک ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض گناہوں پر انسان کو دلیری پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جب وہ یہ اصل قائم کرتے ہیں کہ ایک بڑے گناہ ہوتے ہیں اور ایک چھوٹے گناہ ہوتے ہیں تو کچھ حصہ گناہوں کا وہ اپنے استعمال میں لاتے رہتے ہیں اور خیال کر لیتے ہیں کہ یہ گناہ تو چھوٹا ہے اس کے کرنے میں کونسا زیادہ حرج ہے اس طرح بیماری کا بیج ضائع نہیں ہوتا اور بیماری کے بیج کے ضائع نہ ہونے کی وجہ سے خرابی ہمیشہ عَود کرتی رہتی ہے حالانکہ ہمیں رسول کریم ﷺ کی زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گناہ اور نیکی کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعریف بالکل جُدا گانہ کیا کرتے تھے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس بعض لوگ آئے اور انہوں نے کہا یَارَسُوْلَ اللّٰه ! سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔ پھر کوئی اور آیا اور اس نے دریافت کیا یَارَسُوْلَ اللّٰه ! سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ماں باپ کی خدمت کرنا۔ اس کے بعد کوئی اور شخص آیا اور اُس نے پوچھا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تہجد۔ غرض مختلف سوالات کرنے والوں کو آپ نے ایک ہی سوال کا مختلف جواب دیا، کسی کو جہاد کی طرف توجہ دلائی، کسی کو شب بیداری کی طرف متوجہ کیا، کسی کو ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تلقین کی۔ اب سب سے بڑی نیکیاں تین تو ہو نہیں سکتیں سب سے بڑی نیکی ایک ہی ہوسکتی ہے۔ پس اگر سب سے بڑی نیکی جہاد ہے تو ماں باپ کی اطاعت سب سے بڑی

نیکی نہیں اور اگر ماں باپ کی اطاعت سب سے بڑی نیکی ہے تو تہجد سب سے بڑی نیکی نہیں مگر رسول کریم ﷺ ان میں سے ہر ایک کو بڑی نیکی قرار دیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کا منشاء کیا تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ آپ کا منشاء سب سے بڑی نیکی سے وہ نہ تھا جو عُرفِ عام میں سمجھا جاتا ہے بلکہ آپ کا منشاء یہ تھا کہ درحقیقت ہر انسان کیلئے سب سے بڑا کام الگ الگ ہوا کرتا ہے۔ ایک انسان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں ماں باپ کی عظمت نہیں ہوتی لیکن وہ روپیہ اُڑا دینے کا عادی ہوتا ہے اگر اسے خدا تعالیٰ کے دین کی راہ میں روپیہ خرچ کرنے کے ثواب کا علم نہ ہو تب بھی وہ دنیوی کاموں پر روپیہ اُڑا دینے کی عادت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہیں جو کنچنیوں کے ناچ پر اپنی جائدادیں دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دُنیا میں پائے جاتے ہیں جو ڈوموں کے لطیفوں پر اپنے قیمتی اموال لُٹا دیتے ہیں، ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو آدھ گھنٹہ کے جُوئے کی خاطر اپنی جائدادیں برباد کر دیتے ہیں، ایسا انسان اگر خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جائداد دے دیتا ہے تو وہ کونسا بڑا کام کرتا ہے اُس کے نزدیک تو جائداد کی کوئی قیمت ہی نہیں کہ اُس کی اِس نیکی کو بڑی نیکی قرار دیا جاسکے۔ ایسے انسان کی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ وہ جُوئے سے توبہ کرے۔ ایسے شخص کیلئے چوری سب سے بُرا فعل نہیں کیونکہ چوری کی طرف اسے رغبت نہیں، ایسے شخص کیلئے سب سے بڑا گناہ ظلم نہیں کیونکہ ظلم کی طرف اسے توجہ نہیں، ایسے شخص کیلئے سب سے بڑا گناہ جھوٹ نہیں کیونکہ جھوٹ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، ایسے شخص کیلئے سب سے بڑا گناہ قتل نہیں کیونکہ قتل کا جذبہ اُس کے دل میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا، ایسے شخص کا سب سے بڑا گناہ جُوا ہے کیونکہ بڑا گناہ وہی ہے جس کی عادت ہو جائے اور جس کا چھوڑنا انسان کو مشکل معلوم ہو۔ اس تعریف کے مطابق ایک ایسا انسان بھی ہوسکتا ہے جس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہو کہ وہ مونچھیں نہیں ترشواتا۔ وہ چور بھی نہیں ہوگا، وہ ڈاکو بھی نہیں ہوگا، وہ جھوٹ بھی نہیں بولے گا، وہ دھوکا اور فریب بھی نہیں کرے گا مگر انگریزوں کو دیکھ کر چونکہ اُسے مونچھیں بڑھانے کی عادت ہو چکی ہوگی اِس لئے ہم اِس کے متعلق کہیں گے کہ اس کا سب سے بڑا گناہ مونچھیں بڑھانا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اپنے ایک عزیز کا جو وہابی خیالات رکھتا تھا واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ کوئی بڑا رئیس آپ سے ملنے آیا۔ وہ تہہ بند تکبر سے لٹکا کر چلا کرتا تھا اور اُس

وقت بھی اُس نے اپنی تہہ بند لٹکائی ہوئی تھی اور ٹخنوں سے نیچے پڑ رہی تھی۔ آپ فرماتے ہیں جس وقت اُس عزیز نے اس رئیس کو اس حالت میں دیکھا تو چونکہ وہ نیا نیا علمِ حدیث پڑھ کر آیا تھا اس نے اپنی مسواک اُٹھائی اور اس رئیس کے ٹخنے پر مار کر کہا فِی النَّارِ یہ حصہ دوزخ میں جائے گا کیونکہ حدیثوں میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص تکبّر سے اپنا ازار لمبا رکھے وہ دوزخ میں جاتا ہے [۳]۔ وہ رئیس مسلمان تھا مگر اُسے ہمیشہ اپنی عزت کا خیال رہتا تھا اور اِسی عزت کے خیال سے وہ تہہ بند لٹکا کر باندھا کرتا۔ جب اُس شخص نے ایک بھری مجلس میں اُس رئیس کے ٹخنے پر مسواک مار کر کہا فِی النَّارِ تو فوراً اُس رئیس پر اپنی عزت کا خیال غالب آ گیا اور اُس نے نہایت غصے سے کہا کہ تجھے کس بیوقوف نے بتایا ہے کہ میں مسلمان ہوں میں ہرگز مسلمان نہیں۔ گویا محمد ﷺ کا اگر ایسا حکم ہے تو وہ مسلمانوں پر چل سکتا ہے مجھ پر نہیں چل سکتا۔ اب تہہ بند کے ایک انچ اوپر یا ایک انچ نیچے ہونے میں کیا رکھا ہے مگر ایسے بیسیوں لوگ مل جائیں گے جنہیں اگر یہ کہو کہ تم ایک ہزار مربع لے لو مگر تہہ بند نیچے نہ باندھو تو وہ زمین چھوڑنے کیلئے تیار ہو جائیں گے مگر تہہ بند کا لٹکانا نہیں چھوڑیں گے۔ بلکہ اگر انہیں کہا جائے کہ تمہیں سر کا خطاب مل جائے گا بشرطیکہ تہہ بند لٹکا کر نہ چلو تو وہ سر کا خطاب چھوڑنے کیلئے تیار ہو جائیں گے لیکن اس بات کے چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوں گے کہ تہہ بند ایک انچ اوپر کر کے باندھیں۔ پس ایسے لوگوں کا سب سے بڑا گناہ تہہ بند کو نیچے لٹکانا ہو گا نہ کچھ اور۔

اسی طرح ایک زمیندار جب یہ سنتا ہے کہ کسی شخص نے رسول کریم ﷺ کو گالی دی تو اسے اپنی بیویوں کی محبت، اپنے بچوں کی محبت، اپنے خاندان کی محبت اور اپنی جان کی محبت بالکل فراموش ہو جاتی ہے۔ وہ خاموشی سے ایک گنڈاسہ یا چھرا لیتا ہے اور گھر سے نکل جاتا ہے اور اس شخص کی تلاش شروع کر دیتا ہے جس نے رسول کریم ﷺ کو گالی دی ہوتی ہے، پھر جب وہ مل جاتا ہے تو اُسے قتل کر دیتا ہے اور جب خود پکڑا جاتا ہے تو اَللّٰہُ اَکْبَر کا نعرہ لگاتا ہوا پھانسی کے تختہ پر چڑھ جاتا ہے اور ذرا بھی خیال نہیں کرتا کہ اُس نے کوئی قربانی کی ہے۔ گویا وہ اپنی جان اور اپنا مال اور اپنی ہر چیز رسول کریم ﷺ پر قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائے گا لیکن باوجود اس کے اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ بنیے کے پاس جاتا اور اُس سے سُود لیتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی

ایک خیالی عزت کو قربان نہیں کرتا اور اپنی لڑکی کو ورثہ سے محروم رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی سب سے بڑی نیکی یہ نہیں کہ اُس نے اپنی جان رسول کریم ﷺ کی عزت کی حفاظت کیلئے قربان کر دی بلکہ اس کی سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ وہ سُود نہ لے اور اپنی لڑکیوں کو جائداد سے ورثہ دے۔ یہ صرف چند مثالیں میں نے دی ہیں ورنہ ہزاروں مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور بدی ہر انسان کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے۔

پس جب تک یہ خیال دل میں رہے کہ فلاں بدیاں بڑی ہیں اور فلاں چھوٹی اور فلاں نیکیاں بڑی ہیں اور فلاں چھوٹی اُس وقت انسان نہ بدیوں سے پوری طرح بچ سکتا ہے اور نہ نیکیوں کو پوری طرح حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا میں بڑی بدیاں وہی ہیں جن کے چھوڑنے پر انسان قادر نہ ہو اور جو عادت میں داخل ہو چکی ہوں اور بڑی نیکیاں وہی ہیں جن کا کرنا انسان کو دوبھر معلوم ہو۔ اِس نقطۂ نگاہ کے مطابق کئی نیکیاں ایسی ہو سکتی ہیں جو ایک کیلئے بڑی ہوں مگر دوسروں کیلئے چھوٹی اور کئی بدیاں ایسی ہو سکتی ہیں جو ایک کیلئے بڑی ہوں لیکن دوسرے کیلئے چھوٹی۔ پس جب تک اِس خیال کو دل سے نکال نہیں دیا جاتا کہ چوری ایک بڑا گناہ ہے، زنا ایک بڑا گناہ ہے، قتل ایک بڑا گناہ ہے، غیبت ایک بڑا گناہ ہے اور ان کے علاوہ جتنے گناہ ہیں وہ چھوٹے ہیں یا جب تک اس خیال کو دل سے نکال نہیں دیا جاتا کہ چند نیکیاں بڑی ہیں اور باقی چھوٹی مثلاً روزہ بڑی نیکی ہے، نماز باجماعت بڑی نیکی ہے، زکوٰۃ بڑی نیکی ہے، حج بڑی نیکی ہے اور اس کے علاوہ جتنی نیکیاں ہیں وہ چھوٹی ہیں اُس وقت تک انسان کا عملی حصہ بہت کچھ کمزور رہتا ہے۔ مگر عام مسلمانوں میں اِس وقت یہ مرض پھیلا ہؤا ہے اور وہ یہ کہ وہ بعض نیکیوں کو بڑی اور بعض کو چھوٹی سمجھتے ہیں۔ مثلاً وہ سمجھتے ہیں کہ روزہ سب سے بڑی نیکی ہے اس خیال میں انہیں اس قدر غلو ہے کہ وہ نماز باجماعت چھوڑ دیں گے، زکوٰۃ ساری عمر نہیں دیں گے لیکن جو شخص روزہ نہ رکھے خواہ کسی بیماری اور مجبوری کی وجہ سے نہ رکھے وہ ان کے نزدیک کشتنی اور گردن زدنی ہوگا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ رمضان کے مہینہ میں جبکہ آپ سفر کی حالت میں تھے امرتسر میں تقریر فرما رہے تھے کہ آپ کے گلے میں خشکی محسوس ہوئی۔ ایک دوست نے یہ دیکھ کر آپ کے آگے چائے کی پیالی پیش کی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیالی ہٹا دی

لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُس نے حلق کی تکلیف کے خیال سے پھر پیالی پیش کر دی آپ نے پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ رہنے دو لیکن تیسری دفعہ اس نے پھر پیالی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے آگے کر دی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے غالبًا یہ سمجھ کر کہ اگر میں نے چائے کی پیالی نہ لی تو یہ رِیاء ہو جائے گا اور سمجھا جائے گا کہ میں نے لوگوں کو دکھانے کی خاطر اِس حکم پر عمل نہیں کیا جو سفر کے وقت روزہ نہ رکھنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دیا ہے جب تیسری بار اُس دوست نے پیالی پیش کی تو آپ نے لے لی اور اس میں سے تھوڑا سا گھونٹ بھرلیا۔ یہ دیکھتے ہی لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ وہ لوگ جو اُس وقت شور مچا رہے تھے ان میں سے یقیناً نوے فیصدی نماز با جماعت کیا نماز کے ہی تارک تھے اور یقیناً ان میں سے ننانوے فیصدی جھوٹ بولنے، دھوکا فریب کرنے اور لوگوں کے مال لُوٹ لینے والے تھے مگر اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے ننانوے فیصدی روزہ دار تھے کیونکہ ہندوستان میں روزہ کو سب سے بڑی نیکی سمجھا جاتا ہے مگر روزہ وہ اس طرح نہیں رکھتے جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولتا، غیبت کرتا یا گالی دیتا ہے خدا تعالیٰ کے حضور اس کا کوئی روزہ نہیں ہے وہ صرف بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ اس حدیث کے مطابق گو ننانوے فیصدی مسلمان بظاہر روزہ رکھ کر بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں مگر وہ اس بھوکے پیاسے رہنے کو سب سے بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو شخص روزے رکھ لے اور چند اور نیکیوں پر عمل کر لے اُس کا بیڑا پار ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں پاکیزگی کے قائم کرنے میں کبھی ممد نہیں ہو سکتے اور نہ وہ صحیح معیارِ گناہ قائم کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن میں یہ نقشہ جما لیا ہوتا ہے کہ کچھ چھوٹی نیکیاں ہوتی ہیں اور کچھ بڑی نیکیاں ہوتی ہیں اور کچھ چھوٹی بدیاں ہوتی ہیں اور کچھ بڑی بدیاں ہوتی ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس نیکی کو بڑا سمجھے ہوئے ہوتے ہیں اسے تو وہ اختیار کر لیتے ہیں مگر جن بدیوں کو چھوٹا سمجھ رہے ہوتے ہیں اُن کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے حالانکہ اسلام نے اُسی نیکی کو بڑا قرار دیا ہے جس پر عمل کرنا اُس کیلئے دوبھر ہو اور اُسی بدی کو بڑا قرار دیا ہے جس سے بچنا انسان کیلئے دوبھر ہو۔

پس ایک تو عملی اصلاح میں سب سے بڑی روک یہ ہے کہ لوگ بدیوں اور نیکیوں کے

متعلق ذہنی طور پر فرق کر لیتے ہیں اور کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بعض گناہ بڑے ہیں اور بعض چھوٹے اور بعض نیکیاں بڑی ہوتی ہیں اور بعض چھوٹی ہوتی ہیں۔ وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ جو بڑی بڑی نیکیاں ہیں وہ ہم کر لیں گے اور چھوٹی نیکیوں کو نظر انداز کر دیں گے۔ اسی طرح گناہوں میں سے بھی وہ جن گناہوں کو بڑا سمجھتے ہیں اُن سے بچنے کی کوشش کریں گے مگر اور گناہوں کا اپنے اندر پایا جانا انہیں قابلِ اعتراض امر معلوم نہیں ہوگا حالانکہ چھوٹی نظر آنے والی نیکیاں چھوڑ دینے سے بسا اوقات بڑے بڑے نقصان ہو جاتے ہیں اور معمولی نظر آنے والی بدیاں کر لینے سے بسا اوقات روحانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ پس ان کی قربانی دونوں طرف سے کم سمجھی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے طہارت اور پاکیزگی کا خلعت انہیں عطا نہیں کیا جاتا۔ پھر بعض بدیوں کو چھوٹا سمجھنے کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بدی کا بیج دنیا میں قائم رہتا ہے جو مناسب ماحول کے قائم ہونے پر پھر اُگ آتا ہے۔ اسی طرح جس نیکی کو چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہوتا ہے بسا اوقات وہ بڑی ہوتی ہے اور جس بدی کو چھوٹی سمجھ کر اختیار کر لیا جاتا ہے وہ بسا اوقات اس زمانہ میں نہایت مُہلک اور خطرناک نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ پھر ہر شخص کے نزدیک چھوٹی بڑی بدی الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک شخص جس بدی کو بڑا سمجھتا ہے دوسرا اسے چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرا جس بدی کو چھوٹا سمجھتا ہے تیسرا اسے بڑا سمجھتا ہے جس کے نتیجہ میں دنیا میں ہر بدی کا بیج موجود رہتا ہے۔ اگر سارے لوگ مل کر فیصلہ کر لیتے کہ فلاں بدی بری ہے تو وہ پیدا ہی نہ ہوتی۔ جیسے مسلمان سارے گناہوں سے بدتر گناہ حتّٰی کہ شرک سے بھی بدتر سؤر کھانا سمجھتے ہیں۔ یہ اسی لئے کہ ان میں متفقہ طور پر سؤر کے متعلق یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ اس کا گوشت کھانا بُرا ہے۔ وہ کنچنیاں جو دو دو آنے، چار چار آنے، روپیہ روپیہ، دو دو روپے، چار چار روپے اور پانچ پانچ روپے پر علیٰ قدرِ مراتب عصمت فروشی کرتی رہتی ہیں اور پھر سینہ پر ہاتھ مار کر کہتی ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہم مؤمنہ ہیں، وہ ڈاکو جو دو آنے پر ایک شخص کا خون بہانا جائز سمجھتے ہیں، وہ لوگ جو پندرہ پندرہ، بیس بیس روپے لے کر بے دریغ دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں اور منہ سے اسلام کا اقرار بھی کرتے جاتے ہیں، وہ بھی عصمت فروشی اور قتل کو اتنا بُرا فعل نہیں سمجھیں گے جتنا سؤر کا گوشت کھانے کو۔ جس کی یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سؤر کے گوشت کے متعلق مجموعی طور پر یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ اس کا کھانا

خطرناک گناہ ہے حالانکہ کنچنیوں کا سب سے بڑا گناہ عصمت فروشی ہے اور ایک قاتل کا سب سے بڑا گناہ قتل ہے مگر وہ ان گناہوں کا عادی ہونے کی وجہ سے انہیں تو معمولی سمجھتے ہیں لیکن سؤر کا گوشت کھانا بدترین گناہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کئی ایسے ملیں گے جو جھوٹ بولنے والے ہوں گے لیکن قتل نہیں کریں گے۔ وہ قاتل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے لیکن جھوٹ سے جب انہیں منع کیا جائے گا تو کہہ دیں گے کہ جھوٹ کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ پھر کئی ہیں جو چغلخوری کی عادت رکھتے ہیں وہ جھوٹ سے نفرت رکھتے ہیں لیکن چغلخوری کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کے مقابلہ میں جو جھوٹ بولنے کی عادت رکھتا ہے اور چغلخوری سے محفوظ ہے وہ چغلخور سے سخت نفرت رکھے گا۔ اگر کوئی شخص اس کے پاس کسی کی چغلی کرے گا تو وہ آئندہ کیلئے اس کی شکل تک دیکھنے کیلئے تیار نہیں ہوگا اور اس سے شدید نفرت کرے گا لیکن وہ اس کے سچ کو تو اِدھر سے اُدھر بیان کرنے پر ناراض ہوگا اور خود جھوٹ بول لینا اسے معمولی عیب دکھائی دے گا۔

پس چونکہ ہر انسان اپنی فطرت، اپنی عادت اور اپنے ماحول کے مطابق کسی بدی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا سمجھتا ہے اس لئے ہر بدی کا بیج دنیا میں موجود رہتا ہے۔ گویا یہ منڈی ہمیشہ ہی پُر رونق رہتی ہے اس میں کئی ایسے مل جائیں گے جو قتل کو معمولی بدی سمجھ کر لوگوں کو قتل کرنے والے ہوں گے، کئی ایسے مل جائیں گے جو غیبت کو معمولی بدی سمجھ کر لوگوں کی غیبت کرنے والے ہوں گے، کئی ایسے مل جائیں گے جو جھوٹ کو معمولی بدی سمجھ کر لوگوں کے متعلق جھوٹ بولنے والے ہوں گے، کئی ایسے مل جائیں گے جو دوسرے کے مال کھانے کو معمولی بدی سمجھ کر اپنے بھائیوں کا مال کھانے والے ہوں گے، کئی ایسے مل جائیں گے جو خیانت کو معمولی بدی سمجھ کر خائن ہوں گے، کئی فسق اور فجور کو معمولی بدی سمجھ کر فاسق اور فاجر نظر آئیں گے غرض ہر گناہ کی کاشت کرنے والے لوگ دنیا میں موجود ہوں گے، کوئی کسی گناہ کو چھوٹا قرار دے رہا ہوگا اور کوئی کسی کو اور اسی طرح ہر گناہ کا بیج دنیا میں محفوظ چلا آئے گا۔ ہاں ایک مثال جو سؤر کے گوشت کی میں نے دی ہے اس کی استثناء رہے گی کیونکہ کروڑوں میں سے ایک مسلمان بھی ایسا نہیں ہوگا جو سؤر کا گوشت کھاتا ہو بلکہ مسلمان سؤر کے قریب بھی نہیں پھٹکتا اِلَّامَاشَاءَ اللّٰہُ۔ چند ایسے لوگوں کو جو مغرب میں رہنے کی وجہ سے اس جذبہ کو کھو چکے ہوں مگر وہ اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ کے طور پر ہیں۔ تو جس گناہ کو سارے لوگ ہی بڑا گناہ

قرار دے لیں اُس کا مٹانا کوئی مشکل نہیں ہوتا لیکن جن گناہوں کو کچھ لوگ بڑا اور کچھ لوگ چھوٹا قرار دے رہے ہوں ان کا مٹانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ عقیدہ ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے اور عقیدے کا تعلق دل سے ہے لیکن عمل کا تعلق ظاہر سے ہے۔ انسانی فطرت میں ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ترقی کیلئے اس میں نقل کا مادہ رکھاہؤا ہے۔ اس نقل کے مادہ کا غلط استعمال کر کے کبھی انسان تباہ بھی ہو جاتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مادہ ہمارے فائدے کیلئے رکھاہؤا ہے۔ اگر نقل کا مادہ انسان میں نہ ہوتو وہ مثلاً زبان ہی نہ سیکھ سکے مگر چونکہ نقل کا مادہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھاہؤا ہے اس لئے ماں باپ کو اردو یا انگریزی یا پنجابی بولتے دیکھ کر بچہ بھی وہی زبان بولنے لگ جاتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں کافی زبان سیکھ لیتا ہے۔ یوں کسی غیر زبان کے پڑھنے میں کتنے سال لگ جاتے ہیں لیکن ماں باپ سے سن کر نافہم بچہ بھی چند سالوں میں کتنی مکمل زبان سیکھ جاتا ہے۔ ایک زمیندار ۱۵ سال میں بھی اتنی عربی نہیں پڑھ سکتا جتنی بچپن کی حالت میں ڈیڑھ دوسال کے عرصہ میں وہ پنجابی سیکھ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں یہ نقل کا مادہ اِس لئے رکھا ہے کہ تا انسانی ترقی ہو اور علوم کا سیکھنا اسے بوجھ محسوس نہ ہو مگر یہی نقل کا مادہ کبھی غلط طور پر بھی استعمال ہو کر بچہ کی عملی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے کیونکہ جس طرح بچہ اپنے ماں باپ سے زبان سیکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے ماں باپ کو جھوٹ بولتے دیکھ کر ان سے جھوٹ کی بھی عادت سیکھتا اور جھوٹ کی نقل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یا جب وہ اپنے اِردگرد کسی کو چوری کرتے دیکھتا ہے تو اُس کو دیکھ کر خود بھی چوری کرنے لگ جاتا ہے۔

بچہ میں یہ نقل کی عادت ویسی ہی ہے جیسے بندر میں نقل کی عادت ہے۔ بندر میں بھی نقل کا مادہ بڑی شدت سے پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے بندر کی اس عادت کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کوئی ٹوپیوں کا تاجر تھا وہ بہت سی ٹوپیاں لئے ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ آرام کرنے کیلئے ایک درخت کے نیچے سر پر ٹوپی رکھے سو گیا اور ٹوپیوں کی گٹھڑی پاس رکھ لی۔ اتفاقاً اس درخت پر بہت سے بندر بیٹھے تھے جب بندروں نے دیکھا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی سر پر ٹوپی اوڑھے سویا ہؤا ہے اور اس کے پاس بہت سی ٹوپیاں پڑی ہیں تو وہ نیچے آئے اور

ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک ٹوپی اپنے سر پر اوڑھ لی اور درخت پر چڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ٹوپیوں والے کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ ٹوپیاں غائب ہیں وہ حیران ہؤا اور اُس نے سمجھا کہ کوئی چور اُٹھا کر لے گیا ہے مگر اتفاقاً اس نے اوپر جو دیکھا تو بیسیوں بندر اُسے ٹوپیاں پہنے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ دیکھ کر اُس نے بندروں کو ڈرایا اور دھمکایا مگر انہوں نے کسی طرح ٹوپیاں نہ اُتاریں۔ آخر اُس نے درخت کا پھل جو نیچے گرا ہؤا تھا بندروں کو مارنا شروع کیا۔ جب بندروں نے دیکھا کہ یہ پھل اُٹھا اُٹھا کر ہمیں مار رہا ہے تو انہوں نے بھی درخت کے پھل توڑ توڑ کر اُسے مارنا شروع کر دیا۔ اب چاروں طرف سے جو اُسے پھل لگے تو وہ گھبرا گیا مگر آخر اللہ تعالیٰ نے اسے عقل سے کام لینے کی توفیق دی اور اس نے سمجھا کہ یہ تو محض میری نقل کر رہے ہیں۔ اب میں کوئی ایسا طریق سوچوں جس سے یہ ٹوپیاں میری طرف پھینک دیں۔ اس خیال کے آنے پر اُس نے اپنی ٹوپی سر سے اُتاری اور زور سے اسے زمین پر دے مارا۔ یہ دیکھتے ہی سب بندروں نے ٹوپیاں اپنے اپنے سر سے اتاریں اور زور سے زمین پر پھینک دیں اس تاجر نے انہیں اکٹھا کر لیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

بچوں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے وہ بغیر عقل سے کام لئے دوسروں کی نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جس وقت وہ عقل کی عمر کو پہنچتے ہیں اور انہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ یہ فعل بُرا ہے تو اُس وقت وہ اُن کی عادت میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ بسا اوقات اپنی ماں کو دیکھتے ہیں کہ وہ نمازوں میں سُستی کرتی ہے پھر وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کا باپ گھر میں آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ نماز پڑھی؟ تو وہ جواب میں کہہ دیتی ہے ابھی تو نہیں پڑھی پڑھ لوں گی۔ بچہ یہ جواب سنتا اور دل میں کہتا ہے کہ مجھ سے بھی جب کسی نے پوچھا کہ نماز پڑھی ہے؟ تو میں کہہ دوں گا ابھی نہیں پڑھی پڑھ لوں گا۔ چنانچہ جب وہ ہوش سنبھالتا ہے اور باپ اُس سے پوچھتا ہے نماز پڑھی تو وہ کہہ دیتا ہے ابھی نہیں پڑھی پڑھ لوں گا۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ باپ گھر میں ناراض ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے نماز پڑھی؟ تو ماں جواب دیتی ہے اوہ! میں بھول گئی تھی بچہ یہ جواب سنتا اور دل میں کہتا ہے یہ اچھا نسخہ ہے مجھ سے بھی جب کسی نے پوچھا نماز پڑھی؟ تو میں کہہ دوں گا اوہ! میں بھول گیا تھا۔ پھر کبھی وہ دیکھتا ہے کہ باپ جب پوچھتا ہے کہ نماز پڑھی تو ماں جھوٹ بول کر کہہ دیتی ہے کہ میں نے نماز

پڑھی لی ہے۔ بچہ جانتا ہے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ وہ ہر وقت ساتھ رہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ بھی کہتا ہے جب مجھ سے کوئی پوچھے گا نماز پڑھی تو میں کہہ دوں گا میں نے پڑھ لی ہے۔ چنانچہ بڑے ہونے پر جب باپ گھر میں آتا اور اپنے بچہ سے دریافت کرتا ہے کہ نماز پڑھی؟ تو وہ نہایت دلیری سے کہہ دیتا ہے ابا جان میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ یا بچہ اپنے ہمسایہ میں سے کسی کو جھوٹ بولتے دیکھتا یا چوری کرتے دیکھتا ہے تو اُس کو بھی ان افعال میں لذت آنی شروع ہو جاتی ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ چیز اچھی ہے یا بُری، مزیدار ہے یا غیر مزیدار، وہ صرف نقل کرنی جانتا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچے روتے ہیں اور ان کے رونے کا بظاہر کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا لیکن جب کرید کرید کر بات دریافت کی جائے تو کسی ایسی بات پر وہ رو رہے ہوتے ہیں جس میں محض دوسرے کی نقل کا شوق کارفرما ہوتا ہے۔ میری ایک بھانجی کا ہی ایک واقعہ ہے وہ چھوٹی سی تھی کہ ایک دن اس نے رونا شروع کر دیا۔ اتنی روئی اتنی روئی کہ سب حیران رہ گئے اور وہ کسی طرح چپ کرنے میں نہ آئے آخر بہت دریافت کرنے پر اُس نے کہا کہ میں کیہوں کی کٹوری میں گڑ کے میٹھے چاول ڈال کر کھاؤں گی اس نے کسی کھلائی کی لڑکی کو اس طرح کیہوں کی کٹوری میں گڑ کے میٹھے چاول ڈال کر کھاتے دیکھا تھا بس اس کی نقل کے شوق میں اس نے بھی ضد کر لی اور رونا شروع کر دیا۔ چنانچہ اسے چاول پکا کر دیئے گئے اور کیہوں کی کٹوری میں ڈال کر اس کے آگے رکھے گئے وہ لے کر کہنے لگی میں اسی جگہ زمین پر بیٹھ کر کھاؤں گی جہاں اس نے کھائے تھے۔ چنانچہ وہ زمین پر وہیں بیٹھی جہاں اس نے اپنی کھلائی کی لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا اور میٹھے چاول کھائے۔

اسی طرح مجھے اپنا بھی ایک لطیفہ یاد ہے میں اُس وقت گودیوں میں اٹھایا جاتا تھا ان دنوں میری آنکھیں سخت دکھنے آئیں شدتِ تکلیف سے میں رو رہا تھا کہ ایک عورت نے مجھے اُٹھا لیا اور اِدھر اُدھر پھرنا شروع کر دیا۔ اُس عورت کو چونکہ بھوک لگی ہوئی تھی اِس لئے اُس نے رات کی باسی روٹی لے کر ٹہلتے ٹہلتے کھانی شروع کر دی۔ مجھے ساری عمر میں کبھی کسی چیز کے متعلق اتنی شدید حرص پیدا نہیں ہوئی جتنی اُس دن پیدا ہوئی۔ میں آنکھوں کے درد سے روتا جا رہا تھا اور میری سب سے بڑی خواہش اُس وقت یہ تھی کہ رات کی باسی روٹی اس وقت ہو تو میں اُسے ٹہل ٹہل کر

کھاؤں۔ یہ باسی روٹی کا مزہ نہیں تھا جو مجھے آیا بلکہ ایک نقل تھی جو میں نے کرنی چاہی۔

تو بچپن میں نقل کی شدید عادت ہوتی ہے اور بغیر سمجھ کے بچہ کام کرتا چلا جاتا ہے اگر اسے نیک ماحول میں رکھ دیں تو وہ نیک کام کرتا چلا جائے گا اور اگر بُرے ماحول میں رکھ دیں تو وہ بُرے کام کرتا چلا جائے گا اور جب بڑے ہو کر لوگ اسے سمجھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چیز بُری ہے اسے مت کرو تو اُس وقت وہ ان کے اختیار سے نکل چکا ہوتا ہے لیکن عقیدے میں یہ بات نہیں۔ عقیدہ دماغ میں ہوتا ہے اور اِس وجہ سے عقیدہ نظر نہیں آتا اس لئے عقیدہ میں دوسرے کی نقل نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ خدا ایک نہیں بلکہ تین ہیں تو اِردگرد کے بچوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا ہاں اگر وہ تبلیغ کر رہا ہو تو بچے زبان سے اُس کی نقل کرنے لگ جائیں گے اور شور مچاتے پھریں گے کہ خدا تین ہیں، خدا تین ہیں اور اگر وہ کسی کو کہتے سنیں گے کہ خدا کوئی نہیں تو وہ اس کی نقل کرنے لگ جائیں گے اور کہنے لگیں گے کہ خدا کوئی نہیں۔ لیکن ان امور کے متعلق ان کے دل میں یقین پیدا نہیں ہوگا صرف ان کی زبانیں اسے دُہرا رہی ہوں گی کیونکہ وہ زبان کی بات سن کر اس کی نقل کرنے لگ جائیں گے اور دل کی حالت چونکہ ان پر عیاں نہ ہوگی اس کی نقل کرنے کی وہ کوشش نہ کریں گے۔

غرض عمل کا تعلق چونکہ ظاہر سے ہے اس وجہ سے دوسروں کے عیوب کا جلدی اثر ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے چونکہ عیسائی کی تثلیث کا عقیدہ بچوں کے سامنے نہیں آئے گا کیونکہ وہ اس کے دماغ میں ہے وہ اس کی نقل نہیں کریں گے لیکن اس کی نکٹائی اور پتلون چونکہ بچوں کے سامنے ہوگی اس لئے وہ فوراً اس کی نقل کرنی شروع کر دیں گے اور جب بھی نکٹائی اور پتلون کا ذکر آئے گا وہ اس کیلئے بیتاب ہو جائیں گے۔ اگر عقیدہ ظاہر کی چیز ہوتی تو بچے اس کی بھی نقل شروع کر دیتے مگر عقیدہ چونکہ مخفی چیز ہے اس لئے اس کی نقل کم ہوتی ہے اسے صرف علمی طور پر سمجھایا جا سکتا ہے اور علمی طور پر سمجھانا بچپن کے زمانہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جوانی کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور اُس وقت بچہ اگر عقل سے کام لے تو مفید اور مُضِرّ بات میں فرق کر سکتا ہے۔ پس انسانی فطرت میں چونکہ نقل کا مادہ رکھا گیا ہے اس لئے اگر بچہ اپنے اِرد گِرد لوگوں کو جھوٹ بولتے دیکھتا ہے تو وہ جھوٹ بولنے لگ جاتا ہے، اگر چوری کرتے دیکھتا ہے تو چوری کرنے لگ جاتا ہے، دوسروں کو

لوگوں کے حق مارتے دیکھتا ہے تو یہ بھی حق مارنے کی عادت اختیار کر لیتا ہے، جھوٹی قسمیں کھاتے دیکھتا ہے تو یہ بھی جھوٹی قسمیں کھانے لگ جاتا ہے، گالیاں دیتے دیکھتا ہے تو یہ بھی گالیاں دینے لگ جاتا ہے، نماز کا تارک دیکھتا ہے تو خود بھی نماز کا تارک بن جاتا ہے، روزہ رکھتے نہیں دیکھتا تو اس میں بھی روزہ رکھنے کی عادت پیدا نہیں ہوتی، گائے کا گوشت کھاتے دیکھتا ہے تو گائے کا گوشت کھانے کا عادی ہو جاتا ہے، گائے کے گوشت سے نفرت کرتے دیکھتا ہے تو یہ بھی گائے کے گوشت سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔

سردار فضل حق صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک مخلص صحابی تھے جو فوت ہو چکے ہیں وہ سکھوں کے ایک معزز خاندان اور رئیسوں میں سے تھے اُن کی چڑ ہی لوگوں نے یہ بنائی ہوئی تھی کہ سردار صاحب گائے کا گوشت لائیں یہ سنتے ہی سردار صاحب کو متلی ہونے لگتی۔ بعض دفعہ لوگ انہیں زبردستی گائے کی بوٹی کھلانے کی کوشش کرتے۔ مجھے وہ نظارہ خوب یاد ہے جب مہمان خانہ میں وہ آگے آگے ہوتے اور لوگ پیچھے پیچھے اور لوگ انہیں کہتے آج تو آپ کو ایک بوٹی کھلا کر رہیں گے اور وہ کہتے خدا کیلئے مجھے نہ کھلانا۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ شاید انہی کا واقعہ ہے یا کسی اور نَومسلم کا۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ انہیں یا کسی اور نَومسلم کو بے خبری میں گائے کے گوشت کی ایک بوٹی کھلا دی گئی اور انہیں واقعہ میں قے آ گئی۔ یہ گائے کے گوشت کا ذکر سن کر قے آ جانا کیا چیز ہے وہی بچپن کا اثر ہے جب انہیں گائے کے گوشت سے نفرت دلائی جاتی ورنہ گائے کے گوشت میں کیا رکھا ہے اور بکرے کے گوشت میں کیا۔

تو عمل چونکہ نظر آنے والی چیز ہے اس لئے لوگ اس کی نقل کر لیتے ہیں اور یہ بیج پھر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن عقیدہ چونکہ نظر آنے والی چیز نہیں اس لئے وہ اپنے دائرہ میں محدود رہتا ہے گویا عقیدہ ایک پیوندی درخت ہے کہ اسے خاص طور پر لگایا جائے تو لگتا ہے لیکن عمل کی مثال تخمی درخت کی سی ہے کہ آپ ہی آپ اِس کا بیج زمین میں جڑ پکڑ کر اُگنے لگتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کے عمل کی مثال اس بھٹ کٹیا[۵] کے پودے کی سی ہے جو ہوا سے لڑھکتا پھرتا ہے اور ہر جگہ اس کا بیج آپ ہی آپ اُگتا چلا جاتا ہے اور اُس کا مٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پس عقیدہ اور عمل میں یہ ایک بہت بڑا فرق ہے جس کی وجہ سے بُرے عقیدہ کا پھیلنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بُرے عمل کا پھیلنا آسان ہوتا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ عقیدہ آجل اُمور سے تعلق رکھتا ہے لیکن عمل ایسے امور سے تعلق رکھتا ہے جو عاجل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا اس عملی حالت سے کوئی تعلق نہیں۔ جب ایک سنار زیور تیار کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس میں کھوٹ مِلاؤں یا نہ مِلاؤں کیونکہ کھوٹ ملانے یا نہ ملانے کا تعلق اُس کی شام کی روٹی کے ساتھ ہے۔ پس وہ اپنے قریب کے فائدے کو دیکھ کر ایک راہِ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ یا مثلاً یہ سوال کہ مرنے کے بعد کی زندگی ہے یا نہیں۔ بڑی دُور کا سوال ہے، فرشتے ہوتے ہیں یہ بھی دور کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے نبی سچے ہوتے ہیں اور ان کی باتیں ماننے میں انسان کا اپنا فائدہ ہوتا ہے یہ بھی دور کا سوال ہے، خدا کا کلام انسان پر اُترتا ہے یہ بھی بہت دور کی بات ہے، نجات کس کو ملے گی یہ بھی کوئی قریب کا سوال نہیں لیکن ایک سنار کیلئے یہ بالکل قریب کا سوال ہے کہ ایک شخص جو دو روپے کی چاندی دے گیا ہے میں اسے دو روپیہ کی چاندی کی صورت میں ہی واپس کروں یا پونے دو روپیہ کی چاندی میں چار آنہ کا کھوٹ مِلا کر واپس کروں کیونکہ اِس سوال کا تعلق اُس کی شام کی روٹی اور اُس کی بیوی بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ہے۔ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں اِس میں کھوٹ ملا دوں تو میری شام کی روٹی کا سوال حل ہو جاتا ہے مگر خدا ایک ہے اِس سے اُس کی روٹی یا بیوی بچوں کے کپڑوں کا سوال بظاہر حل نہیں ہوسکتا۔ تو عقیدے کا تعلق دور کے امور سے ہوتا ہے اور عمل کا تعلق قریب کے امور سے ہوتا ہے یعنی عمل کا اثر دنیا کے معاملات پر پڑتا ہے اور عقیدے کا اثر انسان کے ذہنی اثرات اور اُس کی روح پر پڑتا ہے اس لئے عقیدہ کی اصلاح میں دُنیوی ضروریات حائل نہیں ہوتیں لیکن عمل کی اصلاح کے راستہ میں دنیوی ضروریات حائل ہو جاتی ہیں۔ ایک شخص جوش میں آتا ہے اور دوسرے شخص سے لڑ پڑتا ہے اتفاقاً زور سے اُس کا ہاتھ اُس کے دل پر لگتا ہے اور وہ مر جاتا ہے وہ دونوں ایک جگہ اکیلے ہوتے ہیں اُس وقت عاجل اور فوری طور پر اُس کے دل میں خیال آتا ہے کہ میں چُپ کر کے یہاں سے کھسک جاتا ہوں کسی کو کیا پتہ ہے کہ میں نے اسے مارا ہے اگر پکڑا جاؤں گا تو کہہ دوں گا مجھے کیا پتہ اس کو کس نے مارا ہے۔ گویا جھوٹ اور فریب کا عاجل فائدہ اس کے سامنے آ جاتا اور وہ اس میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی توحید سے اس کا اس طرح ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ٹکراؤ اگر ہوتا ہے تو جھوٹ کے ساتھ۔ یا مثلاً غیبت ہے ایک افسر اس

کو تکلیفیں دیتا اور اس پر ظلم و ستم کرتا ہے لیکن یہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا اتفاقاً اس سے اعلیٰ افسر سے اسے ملاقات کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ پہلے ہی اس فکر میں حیران ہوتا ہے کہ میں اپنے دشمن سے کس طرح نجات پاؤں وہ ملاقات کے وقت کیا دیکھتا ہے کہ اتفاقاً اعلیٰ افسر نے کوئی ایسی بات کہی جو اُس چھوٹے افسر کے خلاف ہے تب وہ فوراً خیال کرتا ہے کہ اگر میں بھی اس افسر کے چند عیوب اس کے پاس بیان کر دوں تو یہ اس پر اور ناراض ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہی کہ وہ بڑا افسر چھوٹے افسر کے خلاف ہے اس چھوٹے افسر کے چند اور عیوب بھی بیان کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی غیبت کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ اگر میں غیبت نہ کروں تو میری جان اور مال کا خطرہ دور نہ ہوگا۔ اس خیال کے آنے پر وہ غیبت کا ارتکاب کر لیتا ہے اور بسا اوقات اس کا مقصد اسے حاصل ہو جاتا ہے مگر توحید تو اس طرح اس کے فائدہ سے نہیں ٹکراتی۔ پس غیبت سے بچنے پر وہ قادر نہیں ہو سکتا اور توحید کا دعویٰ کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

یہ صرف دُنیوی لحاظ سے میں بیان کر رہا ہوں ورنہ دینی لحاظ سے تو مؤمن کا خدا تعالیٰ خود محافظ ہوتا ہے اور اسے دشمنوں کے شرور سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض دُنیوی لحاظ سے انسان بعض دفعہ عاجلی فائدہ کیلئے بدیوں کا ارتکاب کر لیتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا عقیدہ اسے ان امور میں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا لیکن اس کا عمل اسے فائدہ پہنچاتا ہے۔ مثلاً وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے پاس جائے اور کہے کہ تھانیدار مجھ پر ظلم کرتا ہے لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ تو اس امر کا ڈپٹی کمشنر پر کوئی بھی اثر نہیں ہوتا لیکن ڈپٹی کمشنر کو متأثر کرنے کیلئے اگر وہ یہ غیبت کرے کہ ہمارے ہاں کا تھانیدار آپ کو بہت بُرا بھلا کہتا رہتا ہے تو اس پر ڈپٹی کمشنر ضرور تحقیق کرے گا اور وہ واقعہ میں درست پا کر تھانیدار کو سزا دے گا اور اس کا دشمن ہو جائے گا اس طرح اس کی آرزو پوری ہو جائے گی۔ تو بسا اوقات بدعمل کا ترک اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ انسان کا عاجل فائدہ اس سے وابستہ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات نیکیوں کو انسان اس وجہ سے ترک کر دیتا ہے کہ انسان کا عاجل نقصان ان سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب مالی قربانی کا وقت آتا ہے تو بعض انسان خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے چندہ دے دیا تو ہم کپڑے کہاں سے بنوائیں گے غرض نیکیاں اور بدیاں عاجل امور سے تعلق رکھتی ہیں اور عقائد کا آجل سے تعلق ہوتا ہے اور چونکہ انسان طبعی طور پر اپنے قریب کی چیزوں سے متأثر ہوتا ہے بعید کی

چیزوں سے متأثر نہیں ہوتا اس لئے لوگ عملی اصلاح کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں اور عقائد پر پختہ رہتے ہیں۔ اور بھی اس کے بعض موجبات ہیں لیکن چونکہ اب تین بج چکے ہیں اس لئے میں انہیں اگلے جمعہ میں اِنْشَاءَ اللّٰہُ بیان کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کردوں تا اس کی اہمیت جماعت کے دوستوں پر واضح ہو جائے۔

فی الحال میں نے تین باتیں بتائی ہیں اور یہ تین باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے عقیدے کی اصلاح سے عمل کی اصلاح بہت زیادہ مشکل ہو جاتی ہے اور یہ باتیں عمل کی اصلاح میں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان باتوں کو مدّ نظر رکھ کر ہمیں علاج سوچنا چاہیئے تا کہ ہم اپنے اعمال میں اصلاح کر سکیں اور جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ دنیا کے عقائد میں عظیم الشان تغیر ہؤا ہے اسی طرح عملی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو جائے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی نصیحت کی تھی اور اب پھر کرتا ہوں کہ احباب کو اپنے اپنے طور پر بھی اس مضمون پر غور کرنا چاہیئے اور میں امید کرتا ہوں کہ جو لوگ اصلاحِ اعمال کے ذرائع پر غور کریں گے وہ پیشتر اس کے کہ میری باتیں سنیں خود اپنے اندر ایسی قوت محسوس کریں گے جس سے وہ نقائص کا بہت جلد ازالہ کر سکیں گے۔ پس میں جماعت کے دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ خود بھی اس مسئلہ پر غور کریں اور اگر ان کے ذہن میں کوئی تجویز آئے تو اس سے مجھے اطلاع دیں تا میں بھی ان کی تجاویز سے فائدہ اُٹھا سکوں۔

(الفضل ۲؍جون ۱۹۳۶ء)

۱؎ البقرۃ: ۴ ۲؎ الحجرات: ۱۵

۳؎ بخاری کتاب اللباس باب مَنْ جَرَّ اِزَارَاہٗ (الخ)

۴؎ بخاری کتاب الصوم باب من لم یدع قول الزور (الخ)

۵؎ **بھٹ کٹیا:** ایک خاردار بوٹی